

# امریکا کے صدارتی انتخابی نتائج جنگ وجدل کے مزید چار سال عالمی سطح پر نئی حکمت عملی کی ضرورت

پروفیسر خورشید احمد

۲۰۰۴ء کے امریکا کے صدارتی انتخابات امریکا کی سوا دو سو سالہ تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ انتخابات بظاہر امریکا کی سرزمین پر اور امریکی ووٹروں کی شرکت سے واقع ہوئے لیکن عملاً ووٹ کے بغیر دنیا بھر کے باشعور اور عالمی سیاست پر نگاہ رکھنے والے افراد اس انتخاب میں شریک تھے جو امریکا اور دنیا کو جارج بش کی خطرناک اور جنگجویانہ سیاست سے نجات دلانے کے لیے کوشاں ہیں۔ ہریڈاشہر، ہرنی وی اسٹیشن، ہراخبار کا دفتر اور ہر سیاسی چوپال پونگ اسٹیشن کا منظر پیش کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پوری دنیا کے باسی اس انتخاب میں بش اور کیری کے انتخابی معرکے میں خود اپنے مستقبل کو متلاش کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے چشم فلک نے امریکا کے کسی بھی انتخابی معرکے میں یہ منظر نہیں دیکھا۔

جہاں تک امریکا سے باہر کی دنیا کا تعلق ہے ہر اخباری جائزہ اور ہر رائے عامہ کا سروے ہماری اکثریت سے جارج بش کے مقابلے میں جان کیری کی کامیابی کا اعلان کر رہا تھا۔ بات صرف عرب، مسلم اور تیسری دنیا تک محدود نہ تھی، بلکہ یورپ اور جنوبی امریکا کے تمام ممالک بشمول

انگلستان میں دیکھی جاسکتی تھی۔ اگرچہ برطانیہ کی حکومت بش کی استعماریت کی طرف دار تھی لیکن وہاں کے عوام بھی بھاری اکثریت سے (کچھ جائزوں کے مطابق ۷۰ اور ۸۰ فی صد) بش کی شکست کے متنبی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آخری نتائج آنے سے پہلے ہی کیری نے شکست تسلیم کر لی تو ان کی امیدوں پر اوس پڑ گئی اور امریکی ووٹروں کی اکثریت سے (گو مقابلہ قریبی تھا اور بش کو عمومی ووٹوں کا ۵۱ فی صد اور کیری کو ۴۸.۵ فی صد ملا اور انتخابی ادارے میں بش کو ۲۷ اور کیری کو ۲۵ ووٹ ملے) جارج ڈبلیو بش مزید چار سال کے لیے امریکا کے صدر منتخب ہو گئے۔

### عالمی رد عمل

حالات کا اگر گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ کہنا حقیقت سے قریب تر ہوگا کہ عالمی رائے عامہ اور امریکا کے زمینی حقائق کو نظر انداز کر کے امریکی ووٹروں کی اکثریت نے جو فیصلہ دیا ہے وہ جارج بش کی جیت سے زیادہ سینیئر کیری کی شکست ہے۔ اس لیے کہ وہ اور ان کی انتخابی حکمت عملی اس جارج بش کو نہ ہلا سکے جس کی خود امریکی عوام کی تائید ۲۰۰۱ء میں ۹۰ فی صد سے کم ہو کر ۲۰۰۳ء میں الیکشن سے چند دن پہلے صرف ۳۹ فی صد رہ گئی تھی (نائب میگزین ۱۵ نومبر ۲۰۰۳ء ص ۲۷)۔ یہ سب امریکی جمہوریت کے مخصوص آہنگ میڈیا کی قوت، منظم اور طاقت ور لابیوں کی اثر انگیزی اور اصول اور اخلاقی اقدار کے بارے میں امریکی عوام کے مسخ شدہ اور ناقص وژن کا کرشمہ ہے کہ تباہ کاریوں کے تشویش ناک چار سالہ ریکارڈ کے باوجود جارج بش صدر منتخب ہو گئے اور اب امریکا اور اقوام عالم کوئی آزمائشوں سے دوچار کریں گے۔

صدر بش نے اپنے مخصوص انداز میں دعویٰ کیا ہے کہ ”امریکا نے فیصلہ دے دیا ہے اور مجھے اپنی پالیسی پر عمل کرنے کے لیے عوام کی جانب سے اختیار (مینڈیٹ) حاصل ہو گیا ہے۔“ لیکن یہ دعویٰ اس اعتبار سے بہت محل نظر ہے کہ امریکا بری طرح تقسیم ہو گیا ہے اور دنیا کے سارے ہی ممالک کے عوام کی سوچ، جذبات اور توقعات اور امریکی قیادت کے عزائم اور اعلان میں اتنا بُعد واقع ہو گیا ہے کہ دنیا امن و سکون، قانون کی حکمرانی، بین الاقوامی انصاف کے حصول اور جنگ و جدل سے پاک زندگی کے لیے اپنے دیرینہ خوابوں کو پراندا ہوتے دیکھ رہی ہے۔

ہر گوشہ ارض پر بشمول امریکا بے یقینی بے اطمینانی اور عدم تحفظ کے مہیب سائے منڈلا رہے ہیں۔ بش صاحب یہ انتخاب خوف (fear) کی فضا پیدا کر کے جیتے ہیں اور اب ساری دنیا اس خوف کی لپیٹ میں آ رہی ہے۔ اگر کہیں کوئی خیر کا کلمہ ادا ہو رہا ہے تو وہ یہ ہے ”بھلا ہوا امریکی دستور کا“ یہ بش کے آخری چار سال ہیں!“ (امریکی دستور کے تحت کوئی تیسری مدت کے لیے صدر نہیں ہو سکتا)

۲۰۰۴ء کے امریکی انتخاب کا ایک غیر معمولی پہلو یہ بھی تھا کہ امریکا اور یورپ کے اہم اخبارات نے، جن کی روایت تھی کہ مضامین تو ہر کتب فکر کے شائع کرتے تھے مگر ادارتی کالموں میں کسی صدارتی امیدوار کی تائید نہیں کرتے تھے، انھوں نے اس روایت کو توڑتے ہوئے سینیٹر کیری کی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود ووٹروں کو امریکا اور عالمی امن کے مفاد میں ان کو ووٹ دینے کا مشورہ دیا تھا۔ اس بات میں نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ اور اکانومسٹ لندن، ایک آواز تھے جو دراصل ”زبان خلق کو تقارہ خدا سمجھو“ پر عمل کرتے ہوئے امریکا اور دنیا کو مزید کش مکش اور تصادم سے بچانے کے لیے کوشاں تھے۔ جب انتخابی نتائج میں بش کو فتح ہوئی تو جرمنی کے مشہور ہفت روزہ Der Spiegel نے سرورق پر امریکا کے مجسمہ آزادی کی آنکھوں پر امریکی جھنڈا باندھ کر امریکی عوام کی بند آنکھوں کا گلہ کیا۔ لندن کا ڈیلی مرڈ چیخ اٹھا کہ:

How can 59,054,087 people be so dumb?

۱۵۹،۰۵۴،۰۸۷ افراد اتنے نہ سوچنے سمجھنے والے کس طرح ہو سکتے ہیں؟

اور ماسکو کا پراودا یہ لکھنے پر مجبور ہوا کہ:

امریکا کے بنیاد پرست عیسائی طالبان کا عکس ہیں۔ دونوں اپنے خدا کی توہین کرتے ہیں اور انکار کرتے ہیں (اکانومسٹ، اسپیشل رپورٹ، ”امریکی اقدار“ ۱۳ نومبر ۲۰۰۴ء، ص ۲۹)

انہی جذبات و احساسات کا اظہار امریکا کے ہمسایہ ممالک کے عوام کر رہے ہیں۔ جارج بش انتخاب کے بعد دو ملکوں میں گئے۔ ایک چلی جہاں انتخابی نتائج کے فوراً بعد ایشیا پیسیفک اکانومک کارپوریشن فورم کا سربراہی اجلاس ہوا اور اس میں ہزاروں انسانوں نے صدر بش کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ وہ یہ بینر اٹھائے ہوئے تھے:

You have blood on your hands. We do not want you here.

تمہارے ہاتھ خون سے آلودہ ہیں۔ ہم تمہیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتے۔

۲۰ سربراہان حکومت اور ۵۰۰ سے زیادہ کارپوریشنوں کے ذمہ داران میں سے سیاہ جھنڈیوں سے صرف ایک شخص کا استقبال کیا گیا اور وہ صدر بش تھے۔ یہ تھا عوامی ردعمل، جارج بش کے انتخاب کے بعد پہلے بیرونی دورے کے موقع پر۔ اس کے بعد ۳۰ نومبر ۲۰۰۲ء کو وہ دوسرے ہمسایہ ملک کینیڈا گئے۔ وہاں بھی دونوں شہروں میں، یعنی اوٹاوا اور ہیملی ٹیکس میں ہزار ہا انسانوں نے اسی طرح احتجاجی نعروں سے ان کا استقبال کیا۔ کینیڈا کے وکلا کی بڑی تعداد نے کینیڈا کے وزیراعظم پال مارٹن کو ایک یادداشت پیش کی جو انسانیت کے خلاف جارج بش کے جرائم کی چارج شیٹ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں جارج بش اور امریکا کے ان جرائم کی فہرست دی گئی ہے جو گذشتہ چار سال میں ان کی قیادت میں وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ ان وکلا نے مطالبہ کیا کہ جارج بش کا استقبال نہ کیا جائے بلکہ جنگی جرائم کے خلاف ان پر اسی طرح مقدمہ چلایا جائے جس طرح جرمنی کی سیاسی قیادت پر دوسری جنگ کے بعد نیورمبرگ ٹرائل کے ذریعے چلایا گیا تھا۔ ایکشن میں کامیابی، حقائق پر پردہ نہیں ڈال سکتی اور پروپیگنڈے کا کروفر عوامی جذبات اور احساسات کو دھندلانہیں کر سکتا۔ امریکا کی موجودہ قیادت اور اس کے حواری حکمرانوں کو ہوا کے رخ کا کچھ نہ کچھ اندازہ کرنا چاہیے کہ۔

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا  
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

انتخابی نتائج: بنیادی عوامل

بلاشبہ ہر ملک کے شہریوں کو یہ حق حاصل ہے کہ جس کو مناسب سمجھیں، مسد قیادت پر سرفراز کریں لیکن عالم گیریت کے ثمرات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ ممالک جو عالمی کردار ادا کر رہے ہیں، ان کی قیادت اور پالیسیوں کی تشکیل میں ان ممالک کے عوام اور قیادتیں بھی حصہ لیں (مداخلت کے بغیر) جو ان کی پالیسیوں سے متاثر ہو رہی ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہمارے

عوام اور سوچنے سمجھنے والے عناصر ان اسباب و عوامل کا گہری نظر سے جائزہ لیں جو امریکا کے انتخابات، اس کے نتائج، اور عالمی پالیسیوں پر اس کے اثرات سے متعلق ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امریکی انتخابات کے جو نتائج نکلے اس کے اہم اسباب کیا ہیں اور ان سے کیا سبق سیکھا جاسکتا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ امریکا ایک ملک نہیں، عملاً ایک براعظم ہے۔ ۱۱۸ ملین ووٹروں نے اس انتخاب میں شرکت کی ہے لیکن تمام معروضی جائزے اس امر پر گواہ ہیں کہ امریکا کے عوام کی دل چسپی کا اصل مرکز و محور بین الاقوامی مسائل اور خارجہ پالیسیوں کے امور کبھی بھی نہیں رہے۔ ان کی اصل دل چسپی اندرونی مسائل سے ہوتی ہے۔ امریکی عوام کی معلومات دوسرے ممالک کے بارے میں بس واجبی سی ہیں۔ گو امریکا ایک مدت سے ایک بڑی عالمی طاقت ہے۔ اس وقت اس کی ۳ لاکھ فوجیں صرف عراق، افغانستان اور جنوبی کوریا ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ۸۰ سے زیادہ ممالک میں موجود ہیں اور عسکری، معاشی اور ابلاغی ان تینوں راستوں سے وہ دنیا پر چھایا ہوا ہے۔ اس لیے امریکا کی قیادت اور اس کی پالیسیوں کی صحیح تفہیم ساری دنیا کے پالیسی بنانے والوں کے لیے ضروری ہے۔

بد قسمتی سے پاکستان کی قیادت اور میڈیا دونوں نے اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا نہیں کی۔ ہمارے ملک میں پالیسی سازی کے اجتماعی شورائی اور اداراتی نظام کا فقدان ہے جس کے نتیجے میں فرد واحد جو چاہتا ہے کرتا ہے اور سرکاری پارٹی کے ارکان اور ذرائع ابلاغ اس کی ہر بات پر تعریف اور توصیف کے ڈونگرے برسانا اپنا فرض منہمی سمجھتے ہیں اور یہی ہماری اصل کمزوری ہے۔ ضروری ہے کہ امریکی معاشرہ اس کے سیاسی نظام کی موجودہ کیفیت، وہاں پالیسی سازی کے طریق کار اور موثر قوتوں کا صحیح ادراک کیا جائے تاکہ پاکستان، اُمت مسلمہ اور دنیا کے دوسرے ممالک اپنے سیاسی، معاشی، تہذیبی اور نظریاتی مقاصد، عزائم اور مفادات کی روشنی میں صحیح خطوط پر پالیسی وضع کر سکیں اور متبادل حکمت عملی وجود میں لاسکیں۔ اسی لیے ۲۰۰۴ء کے انتخابات اور ان میں کارفرما عوامل کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کی ضرورت ہے۔

## ۱- خوف کا احساس

ان انتخابات پر تحقیقی کام کے لیے تو ابھی کچھ عرصہ لگے گا لیکن فوری طور پر جو بات کہی جاسکتی ہے اس میں سب سے اہم یہ ہے کہ ان انتخابات میں فیصلہ کن عنصر کوئی مثبت ہدف یا کارکردگی نہ تھی بلکہ غالب چیز خوف کا احساس تھا جسے صدر بش اور ان کی انتخابی مہم چلانے والوں نے بڑی کامیابی اور چابک دستی سے استعمال کیا۔ امریکا کی ایک امتیازی خصوصیت مادی خوش حالی اور عوام کا احساس امن و سلامتی ہے۔ گزشتہ ۲۰ سال میں کوئی لڑائی امریکا کی سر زمین پر نہیں لڑی گئی۔ دونوں عالمی جنگوں کا میدان جنگ یورپ، ایشیا اور افریقہ تھے۔ امریکی افواج نے شرکت ضرور کی مگر لڑائی امریکی سر زمین پر نہیں ہوئی، اس لیے امریکی عوام و خواص جنگ کی ہولناکیوں اور تباہ کاریوں کا تجربہ نہیں رکھتے۔ پرل ہاربر پر جاپانی حملے کے بعد اکتوبر کو نیویارک کے جڑواں ٹاوروں کی تباہی جس میں دنیا کے ۳۰ ممالک کے ۲ ہزار ۷ سو ۵۲ افراد ہلاک ہوئے دوسرا واقعہ ہے جس نے امریکیوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کیا۔

بش انتظامیہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر عدم تحفظ کے احساس کو نہ صرف اپنی پالیسی کا مرکز و محور بنایا بلکہ پوری انتخابی مہم جنگی خوف زدگی کی نفسیات (war-psychosis) کی بنیاد پر منظم کی اور اس جھانے (trap) میں سینئر جان گیری بھی آگئے۔ انھوں نے بھی عراق اور ”دہشت گردی“ کے خلاف جنگ کے سلسلے میں وہی زبان استعمال کی بلکہ بش سے زیادہ شعلہ بیانی کی کوشش کی جو بالکل مصنوعی تھی۔ فطری طور پر امریکی ووٹرنے زمانہ جنگ کے صدر کو ہی اس جنگ کو جاری رکھنے کے لیے ترجیح دی۔ یہی بش کا ترپ کا پتا تھا کہ جنگ کے دوران کمانڈر تبدیل نہ کرو۔ اس کے باوجود عراق کی جنگ اور دہشت گردی امریکی ووٹروں کی نگاہ میں فیصلہ کن عامل کے طور پر تیسرے نمبر پر تھے، یعنی ۱۹ فی صد جب کہ معیشت اور روزگار دوسرے (۲۰ فی صد) اور اخلاقی اقدار اور خاندان کے نظام کا تحفظ پہلے نمبر (۲۲ فی صد) پر تھے۔

یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ بش اور ان کی سیاسی ٹیم نے عراقی جنگ اور دہشت گردی (بین الاقوامی اور ملکی سطح پر) اور لبرل گیری کی وجہ سے خاندانی نظام اور اخلاقی اقدار (خصوصیت سے ہم جنس پرستی، اسقاطِ حمل اور جنسی بے راہ روی) کو خطرے کے دورخ بنا کر

پیش کیا۔ اور یہی وہ منفی عامل ہے جس کی وجہ سے بش امریکا کے عوام کے مذہبی جذبات ابھار کر خصوصیت سے قدامت پسند عناصر کی تائید کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ برازیل کے صدر لولا ڈی سلوا (Lula de Silva) نے اس پہلو کو بڑے صاف الفاظ میں یوں بیان کیا:

خوف کا استحصال ایک بہت ترقی یافتہ اعلیٰ درجے کی سائنس ہے لیکن برازیل اس کلچر کا قائل نہیں ہے جسے امریکی انتخابات میں فتح حاصل ہوئی۔ ہمیں جس بات پر تشریح ہے وہ یہ کہ اپنی سلامتی کے دفاع کے نام پر امریکا ان جنگوں کو آگے بڑھائے گا جو اس نے شروع کیں۔ (انڈینیشنل ہیورالڈ ٹریبون، یکم دسمبر ۲۰۰۳ء)

اسی احساس کی بازگشت کو فرانس سے لے کر ملائیشیا تک تمام اہم تجزیہ نگاروں کی تحریروں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج امریکا ہی نہیں پوری دنیا ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے مقابلے میں کہیں زیادہ غیر محفوظ اور احساس خطر میں مبتلا ہے۔ اس کا سیاسی فائدہ جارج بش نے بھرپور انداز میں حاصل کیا ہے۔

## ۲- عیسائی قدامت پرست عنصر

دوسرا اہم پہلو امریکا کی سیاسی اور اجتماعی زندگی میں مذہب اور مذہب میں بھی عیسائی قدامت پرستوں اور انتہا پسندوں کا کردار ہے۔ امریکا دنیا کے دوسرے ملکوں میں سیکولرزم اور آزاد خیالی (لیبرلزم) کا علم بردار ہے، مسلمان ممالک کو اپنے زعم میں مذہبی عناصر سے پاک کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے باقاعدہ قانون سازی تک کر رہا ہے، خصوصیت سے پاکستان، سعودی عرب اور ایران کو ہدف بنایا ہوا ہے اور دینی تعلیم کو سیکولر سانچے میں ڈھالنے کے لیے پانی کی طرح ڈال رہا ہے، اور ان ملکوں کی قیادتوں کو سرکاری اور این جی اوز کے ذریعے زبردست لالچے میں مشغول ہے۔ دین اور سیاست کے رشتے کو توڑنا اصل ہدف ہے۔ لیکن خود امریکا کا اپنا کیا حال ہے اور اس میں خصوصیت سے اس موثر، منظم اور نہایت طاقت ور گروہ کا جسے نیوکونز (neo-cons) کہا جاسکتا ہے کیا کردار ہے؟ یہ بات قابل غور بھی ہے اور چشم کشا بھی۔ دستور میں ضرور ریاست اور مذہب کی تفریق کا اصول بیان کیا گیا ہے مگر تازہ ترین جائزے کے مطابق آبادی کا ۸۰ فی صد

کہتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے اور ۶۰ فی صد کا دعویٰ ہے کہ اس کی زندگی میں مذہب ایک موثر اور کارفرما قوت ہے (PEW کا سروے مارچ مئی ۲۰۰۴ء بحوالہ اکانومسٹس ۱۳ نومبر ۲۰۰۴ء)۔ تقریباً اسی تناسب سے اسرائیل کی تائید اور فلسطینیوں سے بے اعتنائی اور مخالفت کی کیفیت ہے۔ اس کی تائید گیلپ کے سروے سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق ۵۰ فی صد سے زیادہ امریکی اس کے قائل ہیں کہ چرچ کو سیاست میں موثر کردار ادا کرنا چاہیے۔

جارج بش نے اس مذہبی جذبے کو بڑی کامیابی سے اپنی سیاسی مہم میں استعمال کیا۔ اپنے کو new-born عیسائی کی حیثیت سے سامنے لایا۔ یہاں تک دعویٰ کیا کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ فرمان خداوندی کے مطابق کر رہا ہوں۔ اس کی الیکشن مہم کا اصل دماغ کارل رود (Karl Rove) تھا۔ اس کی انتخابی حکمت عملی انتہائی کامیاب ثابت ہوئی۔ آئندہ بھی وہ پالیسی سازی میں اہم کردار ادا کرے گا۔

یہ عجیب تضاد ہے کہ بش اور اس کے پالیسی سازوں کو امریکا میں تو مذہب کے کردار کا استحکام مطلوب ہے اور عالم اسلام میں مذہب کے کردار کا استرداد۔۔۔ وہاں انتہا پرستی کو سینے سے لگانا اور یہاں جسے انتہا پرستی کا نام دیا جا رہا ہے اس کے خلاف جنگ اور روشن خیال اعتدال پسندی کی تبلیغ بلکہ اسے قوت کے ذریعے مسلط کرنے کی سعی تبلیغ۔ یہی وہ تضاد ہے جسے اقبال نے جہاد اور جنگ کے پس منظر میں یوں واضح کیا تھا:

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے  
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر  
تعلیم اُس کو چاہیے ترک جہاد کی  
دنیا کو جس کے ہنجر خونیں سے ہو خطر  
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے  
یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کر  
ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے  
مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر



حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات  
اسلام کا محاسبہ، یورپ سے درگزر

۳- انتخابی مہم کا منفی پہلو

امریکا کے صدر ترقی انتخابات کا تیسرا اہم پہلو اس کا منفی رنگ ہے۔ بش صاحب نے خود بھی اور ان کی پوری میڈیا ٹیم نے بھی جان کیری کی شخصیت کو ہدف تنقید بنایا اور اسے منہدم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ نئی زندگی، جنگی خدمات، دو ٹنگ ریکارڈ کون سی چیز ہے جسے استعمال نہیں کیا گیا۔ پوری انتخابی مہم پر ۴ ارب ڈالر خرچ ہوئے جس میں سے ۱۱.۴۵ ارب ڈالر صرف ٹی وی کی اشتہاری مہم پر خرچ کیے گئے اور ایک نہیں دسیوں کتابیں اس مرکزی خیال پر لائی گئیں کہ کیری دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتا۔ (ملاحظہ ہو Unfit

(Jerome Corsi اور John E.O. Neil for Command

اگر دنیا کی سب سے ترقی یافتہ جمہوریت کا یہی معیار ہے تو ”پھر کسے رہنا کرے کوئی؟“ ٹی وی پردونوں امیدواروں کے مقابلے میں جان کیری کی ذہنی برتری اور پالیسی کے معاملات پر مضبوط گرفت کا اعتراف بلا استثناء سب نے کیا لیکن غیر اخلاقی چالیں اس برتری کو بہا کر لے گئیں اور ع

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا ”سرمایہ دار“

امریکی ایجنڈا

بش صاحب کا دعویٰ ہے کہ انتخابی نتائج نے ان کی عالمی پالیسیوں کی تائید کر دی ہے اور اب وہ پہلے سے بھی زیادہ جرأت کے ساتھ اس پالیسی پر گامزن ہو سکیں گے جو مندرجہ ذیل خونی خصوصیات سے عبارت ہے:

۱- تن تہا دنیا کے معاملات کو طے کرنے کی سعی اور اس کے لیے قوت کا بے محابا

استعمال۔

۲- عالمی اداروں کو غیر موثر بنانا یا اپنی چاکری پر مجبور کرنا، خصوصیت سے اقوام متحدہ کو

بے اثر کرنا، اس کے سیکرٹری جنرل کو بلیک میل کرنا اور اس طرح عالمی اداروں کو اپنے اہداف کے لیے استعمال کرنا۔

۳- کسی متبادل قوت کو وجود میں نہ آنے دینا۔

۴- کسی بھی خود ساختہ خطرے کی بنیاد پر پیشگی حملوں کے ”اصول“ کا سہارا لے کر فوجی اقدام کرنا۔

۵- دنیا کے دوسرے ممالک میں جہاں قیادت سے ناخوش ہوں، اسے اپنے اور دنیا کے لیے خطرہ قرار دے کر تہدیبی قیادت پر عمل۔

۶- دنیا میں کسی بھی دوسرے ناپسندیدہ ملک کو کسی بھی صورت میں اور کسی بھی درجے کی نیوکلیئر طاقت بننے سے بہ جبر روک دینا۔

۷- دنیا کے دوسرے ممالک میں قومی تعمیر اور فروغ جمہوریت کے نام پر تبدیلی کی تائید اور معاونت۔

۸- دنیا کے تیل کے وسائل پر قبضہ اور دنیا کی منڈیوں کو اپنی مصنوعات کے لیے آزاد عالمی تجارت کے نام پر حاصل کرنا، اور خود اپنی معیشت میں طرح طرح کی درآمدی پابندیوں اور اعانتوں (subsidies) کو جاری رکھنا۔

یہ وہ بنیادی ایجنڈا ہے جس پر صدر جارج بش اپنی دوسری مدت صدارت میں کاربند رہنا چاہتے ہیں اور ان کے دست و بازو اس کا برملا اظہار کر رہے ہیں۔ انتخابی نتائج کے فوراً بعد جو اقدامات انہوں نے کیے ہیں وہ ہوا کے اس رخ کا پتا دیتے ہیں مثلاً:

۱- کولن پاول سے نجات اور ان کی جگہ کنڈولیز رالیس کو سیکرٹری خارجہ مقرر کرنا جو نیوکوز کی گل سرسبد اور پیشگی حملوں اور حکومتوں کی تبدیلی کے فلسفے کی خالق ہیں۔

۲- سیکرٹری دفاع رونالڈ رمس فیلڈ اور اس کے دست راست پال وولفورٹز کو باقی رکھنا حالانکہ ابوغریب کے واقعے کے بعد سے ان دونوں کی برطانی کا مطالبہ ہر طرف سے ہو رہا ہے لیکن یہ بش صاحب کی آنکھ کے تارے ہیں۔

۳- اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کو فی عنان نے عراق کی جنگ کو برملا ناجائز (illegitimate)

قرار دیا اور امریکا کے مطالبات تسلیم کرنے میں تردد کا اظہار کیا تو ان کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں اور اقوام متحدہ کی کرپشن کی باتیں کی جانے لگیں۔ تیسری دنیا کے ممالک کے شدید احتجاج پر یہ لے فی الحال کچھ مدہم پڑ گئی ہے لیکن اگر کوئی عنان راہِ راست پر نہ آئے تو پھر اس لے کو بڑھایا جاسکتا ہے۔

۴۔ فلوجہ پر حملہ اور عراق میں اجتماعی مزاحمت کی تحریک کو قوت سے کچلنے کے لیے فلوجہ کو ایک نشانِ عبرت بنانے کی کوشش۔ بش کے انتخاب کے بعد فلوجہ میں دوسو کے قریب امریکی فوجی مارے گئے ہیں اور عراقی شہریوں کی ہلاکت کا کوئی ریکارڈ نہیں لیکن اندازہ ہے کہ کئی ہزار افراد شہید ہوئے ہیں۔ فلوجہ میں حکمت عملی کا ایک اہم اور دردناک پہلو یہ تھا کہ سب سے پہلے امریکی فوج نے وہاں کے ہسپتال پر قبضہ کیا تاکہ ہلاک ہونے والوں کا ریکارڈ دنیا کے سامنے نہ آسکے اور زخمیوں کی آہ و بکا بھی دنیا تک نہ پہنچ سکے۔

اس کے ساتھ ہی یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ صدر بش کے قریبی اور اندرونی حلقے کے جو دانش ور بش کی پالیسیوں کے لیے زمین ہموار کرنے کا کام کرتے ہیں، وہ بڑھ چڑھ کر شام، شمالی کوریا، ایران اور سعودی عرب کو آئندہ ہدف بنانے کی باتیں کر رہے ہیں، البتہ خود پاکستان کے صدر ان کے پسندیدہ اور محبوب افراد میں سرفہرست ہیں، ان کی تو تعریف کی جاتی ہے مگر ہر تحریکی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ پاکستان پر مزید دباؤ ڈالا جائے کہ وہ دہشت گردی کی مہم میں اور بڑھ چڑھ کر حصہ لے، خود اپنے لوگوں کو نشانہ بنائے، مدرسوں کا مزاج لادینی بنائے، دینی سیاسی قوتوں کو غیر موثر بنائے، آزاد خیال سیاسی عناصر کو آگے لائے، حدود قوانین اور ناموس رسالت کے قانون کو تبدیل کرے، پاسپورٹ سے مذہب کا خانہ نکالے اور معیشت کو بیرونی مصنوعات کے لیے کھول دے۔

ان اہداف کو حاصل کرنے کے لیے ہر طرف سے یلغار ہے۔ جنرل پرویز مشرف کو اس پوری مہم میں اپنے اصل ساتھی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے بلکہ جمہوریت پسندی کے سارے دعوؤں کے ساتھ ان کی وردی کو بھی (جو فوجی آمریت کی علامت ہے) اس کام کو انجام دینے کے لیے ضروری قرار دیا جا رہا ہے۔ ادھر جنرل صاحب کا بھی حال یہ ہے کہ ایک سال میں چار

بار امریکا تشریف لے گئے ہیں۔ بش اور مشرف کے راز و نیاز کا یہ عالم ہے کہ مع  
ٹاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگر م تو دیگر

### امریکی عزائم

امریکی صدر کے قریب ترین حلقوں کی سوچ کے انداز کو سمجھنے کے لیے ہم صرف یہ  
اقتباس پیش کر رہے ہیں، انھیں دیکھیے اور اندازہ کیجیے کہ امریکی قیادت دنیا کو کہاں لے جانا چاہتی  
ہے اور مسلم ممالک کے سربراہ اس کے آلہ کار بننے کے لیے کس حد تک جانے کو تیار ہیں۔

فرانس کا ایک مشہور دانش ور پٹرک سیل (Patrik Seale) اپنے ایک تازہ مضمون میں  
امریکا کے ذہنی منظر نامے کا یوں جائزہ لیتا ہے اور اسے جمہوریت بذریعہ فتح (democracy by  
conquest) کا نام دیتا ہے:

نو قدامت پسندوں کا استدلال ہے کہ عربوں پر تہذیبی باہر سے، اگر ضروری ہو تو  
طاقت کے ذریعے مسلط کی جانی چاہیے۔ پیشگی فوجی حملہ ایک آپشن رہنا چاہیے۔  
عرب اسرائیلی تنازعے پر عربوں اور مسلمانوں کی مایوسی کو باسانی نظر انداز کیا جاسکتا  
ہے۔ امریکا دشمنی محض گرم ہوا ہے، جیسے ہی امریکا کے دشمنوں کو کچلا جائے گا، یہ اُڑ  
جائے گی۔ ڈگلس فیٹھ اور ولیم کرشل دوسرے آوردہ نیوکوز ہیں جو اپنے اپنے طریقے  
سے پورے گروپ کی سوچ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ فیٹھ پینٹاگون کی درجہ بندی میں  
تیسرے نمبر پر ہے۔ عام طور پر اسی کو کریڈٹ دیا جاتا ہے کہ اس نے وہ خفیہ معلومات  
وضع کیں اور استعمال کیں جن کی وجہ سے امریکا نے جنگ شروع کر دی۔ لیکن حیران کن  
بات یہ ہے کہ وہ برسر منصب ہے اور بش کی دوسری مدت میں اس کے اپنے عہدے  
پر برقرار رہنے کا امکان ہے۔

فیٹھ نے، جسے اسرائیل کا گہرا دوست کہا جاتا ہے، یروشلم پوسٹ سے ۱۲ دسمبر کے  
اپنے خصوصی انٹرویو میں کہا کہ اگر ایران نے اپنے ایٹمی پروگرام کو ترک کرنے میں  
لیبیا کی پیروی نہ کی تو ایران کی ایٹمی تنصیبات کے خلاف فوجی حملے کو خارج از امکان

قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس نے پیش گوئی کی کہ عرب دنیا بشمول مصر، سعودی عرب اور اردن جیسے حلیف ممالک میں آئندہ چار سال میں ہش کی خارجہ پالیسی کا محور جمہوری اصلاحات کو ہونا چاہیے۔

ولیم کرشل حکومت میں شامل نہیں ہے اس لیے وہ زیادہ کھل کر بات کر سکتا ہے۔ وہ امریکی پریس کا اسامہ بن لادن ہے۔ ہمیشہ عرب دنیا اور ایران کے خلاف امریکی جہاد کی دعوت دیتا ہے۔ وہ مکالمے سفارت کاری اور نیم دلانہ اقدامات میں یقین نہیں رکھتا۔ اس کی تکنیک تشدد پر کھلم کھلا اُبھارتا ہے۔

نیوکوز کے ترجمان ویکیلی اسٹینڈرڈ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس نے صدام کا تختہ اُلٹنے کی مسلسل مہم چلائی۔ اب وہ امریکا کو علاقے کے دوسرے ممالک خصوصاً شام پر حملہ کرنے کے لیے اُکسار رہا ہے۔

اپنے مضمون میں کرشل گرجتا ہے: شام ایک دشمن حکومت ہے۔ ہم نے نرم و گرم دونوں طرح کی بات چیت کو آزمایا ہے۔ بات چیت ناکام ہوئی ہے۔ ہمیں اب اسد کی حکومت کو سزا دینے اور روکنے کے لیے اقدام اٹھانے کی ضرورت ہے۔

اس طرح کے فیصلہ کن اقدام کو جائز ثابت کرنے کے لیے وہ شام پر ان سرگرمیوں کی اجازت دینے اور حوصلہ افزائی کرنے کا الزام لگاتا ہے جو نہ صرف ہمارے عراقی دوستوں کی بلکہ براہ راست امریکی افواج کی ہلاکت کا باعث بن رہی ہیں۔

کرشل کیا سفارش کرتا ہے؟ ”ہم شام کی فوجی تنصیبات پر بم باری کر سکتے ہیں۔ ہم دراندازی روکنے کے لیے طاقت کے ساتھ سرحد سے کچھ پار جاسکتے ہیں۔ ہم مشرقی شام میں سرحد سے کچھ دور قصبہ ابوکمال پر قبضہ کر سکتے ہیں جو عراق میں شام کی سرگرمیوں کی منصوبہ بندی اور تنظیم کا مرکز معلوم ہوتا ہے۔ ہم شام کی حزب اختلاف کی کھلے اور چھپے حمایت کر سکتے ہیں۔“

وہ اپنے مضمون کا اختتام ان الفاظ پر کرتا ہے: یہ وقت ہے کہ عراق اور وسیع تر مفہوم

میں شرق اوسط میں جنگ جیتنے کے لیے ہم شام کے معاملے میں سنجیدہ ہو جائیں۔

(روزنامہ Star، لندن، ۱۹ دسمبر ۲۰۰۴ء)

امریکا کی The Inter-Press News میں جم ہوب (Jim Hobe) بش کے

ساتھیوں کے عزائم کو یوں بیان کرتا ہے:

میڈیا کی مہم کا آغاز گذشتہ ہفتے ہوا۔ فاؤنڈیشن برائے دفاع جمہوریت (F.D.D) کے تین تجزیہ نگاروں نے واشنگٹن ٹائمز میں ایک مضمون شائع کیا، عنوان تھا: ”شام کا خونی کردار: اسد عراق کی دہشت گرد بغاوت کو امداد بہم پہنچا رہا ہے۔“ ایف ڈی ڈی (ایک قدامت پرست گروپ ہے جو عموماً اسرائیل کی دائیں بازو لیکوڈ پارٹی کی حمایت کرتا ہے)۔

پھر ولیم کرشل نے جو منصوبہ برائے نئی امریکی صدی (PNAC) کا بااثر صدر ہے ویسکی اسٹینڈرڈ کا ایڈیٹر ہے، اپنے ادارے: شام کے بارے میں سنجیدہ ہونے کی ضرورت میں اسی موضوع کو لیا اور اس نتیجے تک پہنچا کہ عراق کی وجہ سے امریکی فوج پر حقیقی دباؤ کے باوجود دمشق سے معاملہ کرنے کے لیے حقیقی راستے موجود ہیں۔

وال اسٹریٹ جنرل شرق اوسط کے بارے میں نیوکوز کی رائے کا قابل اعتبار اشارہ ہے۔ اس نے اپنے ادارے میں الزام لگایا: ”شام دہشت گرد گروہوں کو مادی امداد پہنچا رہا ہے۔ عراق میں امریکی فوجیوں کو مارنے کے لیے اور عراقیوں کو کھلے عام مزاحمت میں شامل ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔“

اداریہ ”شام کے بارے میں سنجیدگی؟“ میں بش انتظامیہ پر الزام لگایا گیا ہے کہ وہ اشتعال انگیز یوں پر طے جملے سیاسی اشارے اور کمزور رد عمل دے رہی ہے اور اس بات پر ابھارا کہ جس طرح ۱۹۹۸ء میں ترکی نے کردوں کی حمایت کرنے پر دمشق پر حملہ کرنے کے لیے جنگی تیاری کی تھی کم سے کم اسی طرح کے فوجی اقدام کی دھمکی دی جائے۔

حالانکہ شام امریکا سے ہر طرح کا تعاون کر رہا ہے اور اختلاف کا کوئی موقع نہیں دے

## مقابلے کی حکمت عملی

امریکا کی موجودہ قیادت کے عزائم کے بارے میں نہ کسی خوش فہمی کی گنجائش ہے اور نہ غلط فہمی کی۔ البتہ اہم ترین سوال یہ ہے کہ اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے دو باتوں کو سمجھنا ضروری ہے۔

ایک یہ کہ امریکا آج خود اوپر سے نیچے تک بنا ہوا ہے۔ بلاشبہ صدر بش اور ان کے قریبی ساتھی ملک کو ایک خاص رخ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ اس میں مذہبی انتہا پرست، صہیونی قوتیں اور سرمایہ دارانہ نظام کی وہ قیادت جو فوجی صنعتی طاقت (Military- Industrial Complex) سے تعبیر کی جاتی ہے اس وقت اصل فیصلہ کن قوت ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دانش وروں، لبرل قوتوں اور عوام کا بڑا حصہ ان حالات پر دل گرفتہ ہے اور کسی دوسرے راستے کی تلاش میں ہے۔ جارج بش کو ۵۱ فی صد ووٹ ضرور حاصل ہوئے ہیں اور طرح کے سیاسی کتب کر کے حاصل ہوئے ہیں لیکن جن تقریباً نصف ووٹروں نے ووٹ نہیں دیے اور جن ۳۹ فی صد نے کیری اور دوسرے نمائندوں کو ووٹ دیے وہ بھی ملک کی ایک اہم سیاسی قوت ہیں اور کل فیصلہ کن قوت بن سکتے ہیں۔ اس لیے امریکا کو ایک سیاسی وحدت نہیں سمجھنا چاہیے اور اس سے مکالمے میں حکومت کے ساتھ دانش وروں اور دوسرے سیاسی عناصر اور قوتوں تک بھی رسائی حاصل کرنا ضروری ہے۔

دوسری بنیادی بات یہ ہے کہ امریکا اور اس کی قیادت دنیا میں جتنی ناپسندیدہ آج ہے کبھی نہ تھی۔ کبھی امریکا آزادی، خوش حالی، عالمی امن، جمہوریت، ترقی اور انسانی مساوات کی علم بردار قوت کے طور پر جانا جاتا تھا اور اہم لیکن اور ووڈروئلسن سے لے کر جان کینیڈی اور جی کارٹر تک (امریکا کی ساری خرابیوں کے باوجود) دنیا کو ایک مثبت پیغام دیتے تھے لیکن بش سٹیج اور بش جونیئر کے دور میں امریکا کا جو چہرہ دنیا کے سامنے آیا ہے اور اس کے نتیجے میں جو بعد اور دُوری دنیا بھر کے عوام اور بہت سے ممالک کی قیادتوں کی طرف سے واقع ہوئی ہے، وہ عالمی سطح پر دنیا میں امن اور انصاف کے قیام کی تحریک کے نقطہ نظر سے ایک مثبت نئے ہے۔ اسے نظر انداز کر کے حالات کا صحیح جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔

پھر امریکا کی معیشت بھی ایسے دباؤ کا شکار ہے کہ یہ اس کے موجودہ سیاسی کردار کو طویل عرصے تک سہارا نہیں دے سکتی۔ اس وقت بھی امریکا دنیا کا سب سے مقروض ملک ہے اور دنیا کے بجٹ کا ۸۰ فی صد امریکا ہڑپ کر رہا ہے، یعنی تقریباً ۱.۲ ملین ڈالر روزانہ۔ اس کا بجٹ خسارہ اور تجارتی خسارہ دونوں اڑدہے کی طرح منہ کھولے کھڑے ہیں اور یہ صورت حال بہت عرصے نہیں چل سکتی۔ ڈالر پر برابر دباؤ ہے اور یورو ایک متبادل عالمی کرنسی کے طور پر روز بروز ترقی کر رہا ہے۔ یورپ میں امریکا سے بے زاری اور آزاد سیاسی اور معاشی پالیسی سازی کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ چین اور جاپان اپنے اپنے طور پر عالمی قوت کے نئے مرکز کے طور پر رونما ہو رہے ہیں۔ لاطینی امریکا شمالی امریکا کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا ہے اور وہاں ایک بار پھر بائیں بازو کے رجحانات ترقی کر رہے ہیں۔ روس بھی امریکا کی زور زبردستی سے بے زار ہے اور نئے راستوں کی تلاش میں ہے۔

دنیا کے دوسرے ممالک کے لیے امریکا واحد آپشن نہیں اور مستقبل میں سیاست کو ایک بار پھر کثیر قطبیت (multi-polarity) کی طرف بڑھنا ہے۔ پاکستان اور امت مسلمہ کے لیے لمحہ فکریہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو امریکا کے دامن سے نچنی نہ کرے اور اپنے اختیار کو کھلا رکھے اور آہستہ آہستہ خارجہ پالیسی میں آزادی سے قدم بڑھانے کی جگہ (independent space) پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

پھر یہ حقیقت بھی سامنے رہنی چاہیے کہ دنیا کے عوام ایک بڑی قوت ہیں اور ان کو طویل عرصے کے لیے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسئلہ محض حکومتوں کا نہیں عوامی قوت کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ عوامی طاقت کو نظر انداز کر کے کسی پالیسی کو زیادہ دیر تک نہیں چلایا جاسکتا۔ اس لیے خارجہ پالیسی کے دروبست درست کرتے وقت اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ان حالات میں پاکستان کی خارجہ پالیسی پر خصوصیت سے امریکی انتخابات کے نتائج کی روشنی میں ازسرنو غور کی ضرورت ہے۔ امریکا، یورپ، چین، روس، افریقی اور ایشیائی ممالک سے تعلقات کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کے سیاسی اور معاشی اتحاد کے لیے اقدامات اور کسی نہ کسی شکل میں مشترک دفاع کے نظام کو حقیقت کا روپ دینا، ہمارے وجود آزادی اور تہذیبی تشخص



کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے ہر سطح پر کھلی بحث ہونی چاہیے۔ جس سہل انگاری اور کوتاہ بینی کے ساتھ جنرل پرویز مشرف اور ان کی ٹیم نے پاکستان کو بالکل امریکا کی جھولی میں ڈال دیا ہے اور مکمل طور پر امریکی گھڑے کی چھلی کے طور پر خارجہ پالیسی کی تشکیل کی جا رہی ہے وہ ملک کے مفاد سے متصادم اور تاریخ کے رخ کے حقیقی فہم سے عاری ہے۔

وقت آ گیا ہے کہ ان امور پر کھل کر بحث ہو پالیسی سازی کا کام تمام سیاسی قوتوں کے مشورے سے انجام پائے پارلیمنٹ یہ کام کرے اور کسی ایک فرد کو سیاہ و سپید کا مالک نہ بننے دیا جائے۔ ہماری کمزوریوں کا بڑا سبب پارلیمنٹ کی بے بسی اور اجتماعی اور اداراتی انداز میں پالیسی سازی کا فقدان ہے۔ اب اس روش کو یکسر بدلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کے لیے دستور کی مکمل بحالی پارلیمنٹ کی بالادستی اور تمام جمہوری سیاسی اور دینی قوتوں کا ایک جان ہو کر ملک اور اس کے نظریاتی سیاسی اور تہذیبی تشخص کی حفاظت اور تحریک پاکستان کے اصل مقاصد کے مطابق ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے جدوجہد کرنا ناگزیر ہے۔ عزت اور آزادی کا یہی راستہ ہے۔ اس وقت ذرا سی غلطی بڑے دور رس اثرات اور نتائج پر منتج ہو سکتی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تمام جمہوری قوتیں اس بنیادی مقصد کے لیے مل جل کر جدوجہد کریں۔